نقد و نظر

مزید اشکالات

بسلسلہ مروجہ نظام زمینداری اور اسلام

——— از قلم محمد اکرم خان

جناب مولانا محمد طاسین صاحب کا مضمون "توضیح اشکالات" کے عنوان سے حکمت قرآن (۳، ۱۱) مارچ ۱۹۸۴ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے۔ جو میرے اُن چند سوالات کے جواب میں ہے جو اُن کے مضمون "مروجہ زمینداری اور اسلام" پر میں نے کئے تھے، یہ سوالات حکمت قرآن کے ستمبر ۸۳ء کے شمارے میں شائع ہوئے تھے۔ چونکہ مولانا محمد طاسین صاحب کے جواب سے میرے ذہن میں مزید سوالات پیدا ہوگئے ہیں۔ لہذا مسئلہ کی مزید تنقیح کی خاطر یہ سطور لکھ رہا ہوں۔

میں جناب مولانا محمد طاسین صاحب کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے میرے سوالات کا نہایت وضاحت سے جواب تحریر فرمایا۔ اس سے مجھے ان کا نقطۂ نظر سمجھنے میں بہت آسانی ہوئی ہے۔

پہلا سوال

افراط زر اور سود سے متعلق ہی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں، زر کاغذی یعنی نوٹ حقیقی طور پر اور بذات خود مال نہیں بلکہ تبادلۂ مال کا ذریعہ تسلیم کر لینے کی وجہ سے مجازی طور پر مال ہیں۔ دنیا میں افراطِ زر کا اصل سبب کاغذی کرنسی کا رواج ہے اس کے ختم ہوتے بغیر انسانیت کو افراطِ زر کی مصیبت سے چھٹکارا ملنا مشکل ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب تک بارٹر سسٹم کے تحت اجناس کا تبادلہ اجناس سے ہوتا تھا یا جب تک رائج الوقت سکے سونے چاندی کے ہوتے تھے، کبھی افراطِ زر کا مسئلہ اس طرح پیدا نہیں ہوا۔۔۔

دوسری طرف بعض ایسی مشینوں کی ایجاد نے کچھ لوگوں کے لئے جعلی کرنسی چھاپنے کا موقع فراہم کر دیا ہے جو کہ اصل کی ہو بہو کاپی کرتی ہیں حتیٰ کہ اصل و نقل میں کچھ امتیاز نہیں ہو سکتا، پھر اس میں کچھ اضافہ ان شراکتی کمپنیوں اور بنکوں کے ذریعے بھی ہوا جو اپنی مالی حیثیت سے زیادہ کاغذی شیئرز اور سندات جاری کرتے ہیں۔ (صفحہ ۶)

اول یہ بات کہ زرِ کاغذی حقیقی مال نہیں ہے ایک پرانی رائے ہے جو اس زمانے میں قائم کی گئی تھی جب زرِ کاغذی کا آغاز ہوا تھا۔ اب آہستہ آہستہ زرِ کاغذی تمام کاموں میں استعمال ہوتا ہے اور ساری دنیا میں اس کا کہیں بھی تبادلہ سونا یا چاندی سے نہیں ہو سکتا، لہذا عملاً زرِ کاغذی اسی طرح

سے مال ہے جس طرح کہ کوئی دوسرا مال۔ یہی وجہ ہے کہ زر کاغذی پر زکوٰۃ ادا کی جاتی ہے۔ اگر یہ مال حقیقی معنوں میں نہیں تو پھر اس پر زکوٰۃ بھی عائد نہیں ہونا چاہیئے۔ حالانکہ یہ رائے کسی کی بھی نہیں ہے۔

دوم، یہ رائے کہ افراطِ زر کا علاج زر کاغذی سے دوبارہ دھاتوں کے زر یا بارٹر سسٹم کی طرف پلٹنا ہے محلِ نظر ہے۔ اس کی حمایت میں پوری دنیا میں ایک رائے بھی نہیں ہے نہ کسی تجزیے کے ذریعے سے اسے ثابت کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی پوری دنیا میں اس پر کوئی عمل کرنے کو تیار ہوگا، ایسا علاج خواہ اسلام کے نام پر پیش کیا جائے یا منطق کے زور پر، کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

سوم، جعلی کرنسی افراطِ زر کا ذریعہ ہے، ایک نئی بات ہے، پوری دنیا میں کس قدر جعلی کرنسی گردش میں ہے، کسی کو معلوم نہیں ہے، لہٰذا اس طرح کی بات ثابت نہیں کی جا سکتی۔

چہارم، شراکتی کمپنیوں اور بنکوں کے کاغذی شیئرز اور سندات" سے مولانا کی کیا مراد ہے، مضمون سے واضح نہیں ہوتا۔ افراطِ زر میں یہ کس طرح ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں، یہ بھی پتہ نہیں چلتا۔ آگے چل کر مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

"لہٰذا اسلام کی رو سے اِن (کرنسی نوٹ) کے قرضہ میں اس امر کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ بوقت قرضہ اِن نوٹوں سے کوئی حقیقی مال کتنی مقدار میں مل سکتا تھا، جتنی مقدار میں وہ مال مل سکتا تھا، نوٹوں کی تعداد کی بجائے اس کو قرضہ متصور کیا جائے اور پھر ادائیگی اس کے مطابق ہو۔ مثلاً زید نے بکر کو سو روپے کے کرنسی نوٹ ایک سال کے لئے بطور قرض دیئے جب کہ دیتے وقت ان کے عوض بازار میں ایک من غلہ مل سکتا تھا تو اس صورت میں نوٹوں کی بجائے ایک من غلہ کو قرض تصور کیا جائے گویا بکر نے زید سے ایک من غلہ ایک سال کے لئے قرض لیا۔ لہٰذا ایک سال کے بعد بکر پر لازم ہوگا کہ وہ زید کو اتنی رقم ادا کرے جتنی اس وقت ایک من گندم یا چاول کے برابر ہو۔ (صفحہ ۹)

اس سلسلے میں درج ذیل باتیں قابلِ غور ہیں۔

اوّل، یہ بات متنازع فیہ شکل اختیار کر سکتی ہے کہ کسی وقت حقیقی مال کیا ہو، بیسیوں اشیاء میں سے کس چیز کو آپ معیار کے طور پر اختیار کریں گے۔ اور جس چیز کو اختیار کریں گے اس کی شرعیت سے کون سی سند لائیں گے؟

دوم، اس وقت دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کی اپنی قدر و قیمت یکساں رہتی ہو، حتیٰ کہ سونا بھی روز گھٹتا بڑھتا ہے۔ پھر ایسی چیز جو خود یکساں قدر و قیمت کی مالک نہ ہو، مذکورہ بالا صورت میں قدر و قیمت کا معیار کیسے قرار دی جا سکتی ہے؟

سوم، اور یہ سب سے اہم بات ہے کہ جناب مولانا طاسین صاحب نے اپنے مذکورہ حل میں یہ طے

کر دیا ہے کہ روپے کے بدلے روپے کے ادھار تبادلے کی صورت میں قدر و قیمت (QUALITY) کا اعتبار کیا جائے گا۔ یعنی اگر قدر و قیمت میں فرق آجائے تو تبادلہ برابر سرابر نہ ہوگا بلکہ اصل قدر و قیمت کے مطابق طے پائے گا، حالانکہ یہی وہ بات ہے جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحتاً ربا الفضل کہہ کر حرام قرار دیا ہے۔ وہ مشہور حدیث جس میں ایک صحابیؓ تین صاع گھٹیا کھجوروں کے بدلے میں دو صاع عمدہ کھجوریں لے آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ربا الفضل قرار دیا اسی بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اشیاء کے تبادلے میں اگر وہ ایک ہی جنس کی ہوں قدر و قیمت (QUALITY) کا اعتبار نہ ہوگا بلکہ کمیت (QUANTITY) کا اعتبار ہوگا۔ جناب مولانا محمد طاسین صاحب کے مذکورہ بالا حل میں روپے کے تبادلے میں اصل اعتبار قدر و قیمت (QUALITY) کا ہے جو اس کو صراحتاً ربوا الفضل کا معاملہ بنا دیتا ہے۔

دوسرا سوال

مزارعت میں زمین کی پیداواری صلاحیتوں کے معاوضے کا سوال ہے۔ اس پر موصوف تحریر فرماتے ہیں "یہ زمین میں جو پیداواری صلاحیت ہوتی ہے، وہ قدرتی اسباب و عوامل کے زیر اثر وجود میں آتی ہے اور ایک خالص قدرتی چیز ہوتی ہے اور وہ اس شخص کے لئے قدرت کا مفت عطیہ ہوتی ہے جو زمین کو کاشت کرتا ہے۔" (صفحہ ۶۱)

یہ ایک دلچسپ اندازِ بحث ہے، اگر زمین کی پیداواری صلاحیتیں قدرت کا عطیہ ہیں تو انسانی پیداواری صلاحیتوں کے بارے میں مولانا کی کیا رائے ہے؟ کیا انسان ان کا مالک و خالق ہے؟ جس منطق کی رو سے موخر الذکر کا معاوضہ جائز ہے اس کی رُو سے اوّل الذکر کا ہونا چاہیئے۔ مولانا کے پاس ان میں فرق کرنے کے کون سے عقلی دلائل ہیں؟

تیسرا سوال

صرف محنت کے عامل پیدا کش ہونے کے بارے میں ہے، یہ بحث معاشیات کی کتابوں میں بہت تفصیل سے موجود ہے کہ سرمایہ عامل پیدا کش ہے یا نہیں، سرمایہ دارانہ معیشت اور اشتراکی معیشت کے علمبرداروں نے اپنی اپنی طرف سے بہت دلائل دیئے ہیں اور معاملہ کسی طرح سے بھی فیصلہ کن شکل اختیار نہیں کر سکا۔ البتہ ہم اس فریم ورک میں رہتے ہوئے جو خود جناب محمد طاسین صاحب نے اپنے لئے مہیا کیا ہے درج ذیل معروضات پیش کرتے ہیں:

اوّل، مولانا بھی تسلیم کرتے ہیں کہ سرمایہ اصل میں ماضی کی محنت ہی ہے (صفحہ ۶۶) جو کہ سرمایہ کی شکل میں جمع ہو گئی ہے، اس صورت میں سرمائے کا معاوضہ نہ ہونا عقل کے خلاف ہے۔ کیونکہ سرمایہ کچھ نہیں ہے سوائے جمع شدہ محنت کے اور محنت کے معاوضہ کے مولانا خود قائل ہیں، لہٰذا سرمائے کے معاوضے کی مخالفت سمجھ میں نہیں آتی۔

دوم، مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ و محنت کی تمام کش مکش اس وجہ سے

ہے کہ فریقین کا حصہ طے کرنے کا کوئی دائمی اور عادلانہ فارمولا نظام میں نہیں ہے۔ اب اسلامی نظام کو لیجئے۔ فرض کیجئے ایک شخص اپنے سرمائے اور محنت سے کاروبار کر رہا ہے، وہ اپنے ساتھ کسی دوسرے شخص کو شریک کر لیتا ہے جو صرف محنت کر سکتا ہے اور اس کے پاس سرمایہ نہیں ہے فرض کیجئے دونوں ایک ہی صلاحیت کے انسان ہیں اور یکساں اوقات کام کرتے ہیں، اسلامی نظام میں ان کے درمیان منافع کی تقسیم کیسے ہوگی؟ ایک صورت یہ ہے کہ دوسرا شخص ملازم ہو۔ اس صورت میں بھی چونکہ پہلا شخص اور دوسرا شخص برابر کی محنت کر رہے ہیں، مولانا کے انصاف کی رُو سے دونوں کو برابر برابر حصہ ملنا چاہیئے (چونکہ سرمایہ تو عامل پیدائش ہی نہیں ہے) زیادہ سے زیادہ پہلا شخص سرمائے کی فرسودگی مزید لے سکتا ہے، کیا مولانا کے نزدیک یہی صورت تقسیم منافع کی ہوگی یا کوئی دوسری؟ اور اگر یہی ہوگی تو کسی بھی غیر جانب دار معقول آدمی سے پوچھ لیں کہ کیا یہ انصاف ہوگا؟ شریعت کے معیار کی بات تو بہت دور کی ہے، عقل سلیم بھی اسے تسلیم نہیں کرے گی، علاوہ ازیں خود معاشی قوتیں اتنی مضبوط اور طاقت ور ہیں کہ وہ اس طرح کے "انصاف" کو ہوا میں تحلیل کر دیں گی، کوئی شخص بھی اپنے سرمائے اور محنت کے ساتھ صرف محنت کرنے والے کو برابر کا شریک نہیں ٹھہرائے گا، تب محنت کرنے والے کہاں کام کریں گے؟ سرمایہ کہاں سے فراہم ہوگا؟ خود مولانا تسلیم کرتے ہیں کہ اس نظریہ کے سب سے بڑے علمبردار اشتراکی ممالک بھی اس پر عمل نہ کر سکے، یہی نہیں، اسلام کی چودہ سو سال کی تاریخ میں سے کسی دور، کسی ملک (بشمول خلفائے راشدین) میں دکھا دیجئے کہ کہاں یہ بات رائج رہی ہے کہ معاوضہ کا حق صرف محنت کو رہا ہو؟ یہ ایک ایسا خواب ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں ہے، اگر علامہ ابن خلدون یا کسی دوسرے مفکر نے ماضی میں بھی یہ رائے رکھی ہے تو اس سے چنداں فرق نہیں پڑتا عمل کب اس پر ہوا ہے؟ اس کے کیا امکانات ہیں کہ اس پر آئندہ بھی عمل ہو سکے۔

صرف محنت کو معاوضے کا حق دلا کر ہم بہت سی اور پیچیدگیوں کا دروازہ بھی کھولتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں حکومتوں اور کاروباروں کے لئے سرمائے کا ایک بڑا حصہ گھریلو بچتوں (House hold savings) کی شکل میں میسر آتا ہے۔ اگر ان بچتوں کو مفید طور پر استعمال کرنے کا محرک چھین لیا جائے تو کون اپنا سرمایہ کاروباروں اور حکومتوں کو دے گا؟ شریعت کی کوئی ایسی تعبیر جس سے آپ انسانیت کو مفید کاموں سے محروم کر دیں کسی دور میں بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ یہ صحیح ہے کہ ان بچتوں پر شریعت نے سود کو حرام قرار دیا ہے، لیکن اس سے بڑھ کر اسے مضاربت و شراکت کی بنیادوں پر لگانے پر بھی پابندی لگا دی جائے تو اس سے خواہ مخواہ شریعت کا قافیہ تنگ ہو جائے گا۔ یہ فقہی بحث کہ شرکت کے لئے محنت لازم اور مضاربت ایک مشتبہ شکل ہے، اس عظیم منفعت کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے جو انسانیت کو اس سرمائے کے استعمال سے پہنچ سکتی ہے۔

یہی نہیں، اگر آپ لوگوں کو مضاربت پر سرمایہ لگانے سے روکتے ہیں کیونکہ آپ کے نزدیک یہ فی الاصل مباح نہیں بلکہ مشتبہ ہے، تو آپ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو جو حلال ذرائع سے روپیہ کما کر کچھ بچا لیتی ہے اور پھر مضاربت کے ذریعہ اس میں اضافہ کر لیتی ہے اس آسانی سے محروم کرتے ہیں۔ اس طرح سے بیوہ عورتیں اور یتیم بچے جو خود کما نہیں سکتے، شریعت کی اس اجازت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اسلامی مثالی معاشرے میں بیواؤں اور یتیموں کی نگہداشت حکومت کرتی ہے لہٰذا انھیں مضاربت کی ضرورت نہیں تو یہ ایک کم تر درجے کا اہتمام ہے۔ کیونکہ آپ لوگوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے سے روک کر حکومت کی مشینری کا محتاج رکھنے کا حل بتا رہے ہیں، اور ساری دنیا گواہ ہے کہ یہ ایک غیر مستند (INEFFICIENT) حل ہے۔

اس سے اگلی بات یہ ہے کہ شریعت نے وراثت میں عورتوں کا حصہ رکھا ہے، اگر عمیق نظر سے دیکھا جائے تو دو عورتوں کے برابر ایک مرد کے حصہ کی رُو سے کسی معیشت کی تمام دولت کے ایک تہائی حصہ کی مالک عورتیں قرار پاتی ہیں۔ شریعت کی مروجہ تعبیر کی رُو سے عورتوں کا جو معاشرتی رول ہے وہ انھیں اجازت نہیں دیتا کہ وہ مردوں کے شانہ بشانہ کاروبار کریں اور محنت کر کے کمائیں۔ اس طرح سے وہ ایک تہائی دولت جس کی عورتیں قانوناً مالک ہیں یا تو بے کار رہے یا پھر مضاربت کے ذریعے سے کاروبار میں لگے۔ مضاربت کے خلاف جو بھی فقہی اعتراضات ہوں ان پر از سر نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ مضاربت کو مشتبہ یا مکروہ قرار دے کر ہم شریعت سے ایک ایسی وسعت کو واپس لے رہے ہیں جو کہ اس دور کے ان گنت مسائل کا حل کر سکتی ہے۔

اس کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عربوں کے تجارتی قافلے جاتے تھے جن میں مکے کی عورتیں اور بوڑھے مرد پیسہ لگاتے تھے۔ یہ قافلے مضاربت کی بنیاد پر سرمایہ جمع کرتے تھے اور کاروبار کرتے تھے۔ ویسے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مضاربت رائج تھی، تاریخی طور پر اس کا ثبوت موجود ہے (بعد کے ادوار میں بھی یہ موجود رہی ہے اس پر مستشرقین نے بیش قیمت تاریخی شواہد جمع کیے ہیں) لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اس سے نہیں روکا، اور یہ اصول مسلمہ ہے کہ اگر کسی رائج الوقت عُرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع نہیں فرمایا تو وہ عرف جائز ہے۔

اس دور میں جب کہ سود ہماری زندگی میں خون کی طرح پیوست ہے اور معاشی پیچیدگیاں اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہیں، ایسے اجتہادات کی ضرورت ہے جو لوگوں کو حلال کے اندر رہتے ہوئے آسانی فراہم کریں نہ کہ ایسا قافیہ تنگ کیا جائے کہ لوگ چاہیں بھی تو شریعت پر عمل نہ کر سکیں۔ جن چیزوں کو شریعت نے حرام نہیں کیا ہم انھیں خود سے حرام کر کر کے لوگوں کی دشواریوں میں اضافہ کئے جا رہے ہیں۔